انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۳ - شمارہ ۱۹	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۱۵ر مئی سنہ ۱۹۶۴ء

اداریہ

علاقائی زبانوں سے رشتہ مضبوط کیجیے

جدید ہندوستانی زبانوں میں صرف اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے ملک کے ہر حصے میں موجود ہیں اور کئی ریاستوں میں خاصی بڑی تعداد میں ہیں پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ علاقائی زبانوں کا معیاری ادب ابھی تک اردو میں اس حد تک منتقل نہیں ہو سکا جس حد تک ہونا چاہیے اردو ادب کے شاہکار علاقائی زبانوں میں بڑی تعداد میں منتقل ہوئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ضرورت کو پہچانیں اور جلد سے جلد اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھائیں۔ اس سلسلے میں انجمن کی ریاستی شاخیں بڑا کام کر سکتی ہیں۔ جہاں ان کو اپنے علاقے میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے اور اردو دوستوں کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا ہیں، وہاں ان کا یہ بھی کام ہے کہ اس ریاست کی سرکاری زبان کے ادب عالیہ کو اردو میں منتقل کرنے اور اردو ادب کے شاہکاروں کو اس زبان میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ کام کی ضرورت جنوبی ہند میں ہے۔ تامل، تیلگو، کنڑ، ملیالم ادب کے بہت کم شاہکار اردو میں منتقل ہو سکے ہیں اور ان زبانوں کے پڑھنے والے ہو سکتا ہے غالب سے یا کسی اور شاعر سے واقف ہوں، مگر وہ اردو نظم، اردو غزل، اردو افسانے ناول، طنز و مزاح، سوانح نگاری اور تنقید سے بہت کم واقف ہیں۔ کبھی کبھار بنگالی، گجراتی، مراٹھی پنجابی، کشمیری کے کچھ افسانے اور اکا دکا نظمیں اردو رسالوں میں ترجمہ ہوتی ہیں، لیکن اڑیہ اور آسامی کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بنگالی ادب کے بہت سے شاہکار اردو میں آگئے ہیں مگر کچھ تراجم کو چھوڑ کر بیشتر براہ راست بنگالی سے نہیں آئے۔ یہ دور تراجم کا ہے اور ہمیں ایک طرف علاقائی زبانوں کے شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ کرکے اردو والوں کو اس علاقے کی روح سے آشنا کرنا ہے، دوسری طرف اردو ادب کی ہندوستانی فضا کا سب علاقائی زبانوں کے پڑھنے والوں کو احساس دلانا ہے۔ اس سلسلے میں ہندی علاقے کے علاوہ دوسرے علاقوں میں رہنے والے اردو دوست بہت بڑا رول ادا کر سکتے ہیں۔ دراصل ہمیں درجنوں ایسے مترجم چاہئیں جو کسی زبان کے شاہکار اردو میں اور اردو کے شاہکار اس زبان میں منتقل کر سکیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ علاوہ اردو ادب کے مالا مال ہونے کے، ان علاقوں میں اردو سے دلچسپی بڑھے گی اور وہاں کے لوگوں میں اردو زبان کی تعلیم اور اس کے ادب کی اشاعت کے کام کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی۔ ہندی اور اردو کا

اس اشاعت میں

رشتہ دو طرفی نوعیت کا ہے اور ہندی میں اُردو کا اور اُردو میں ہندی کا ادب اچھا خاصا آ گیا ہے، اس لئے اس پر یہاں کچھ نہیں کہنا ہے۔ ریاستی شاخوں کو جلد سے جلد اس کام کے لئے منصوبے بنانے چاہئیں اور خود کفالتی بنیاد پر ایسے ادارے چلانے چاہئیں جو اس اہم کام کو تجارتی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب بنا سکیں مرکز اس سلسلے میں مناسب مشورے دیتا رہے گا۔

سیر بین

اب تک شعراء نے اپنے مجموعوں کے جو نام تجویز کئے ہیں، ان میں سب سے انوکھا رئیس امروہوی کے مجموعے کا نام ہے۔ "الف"۔ کلام سے قطع نظر خوب ہے، نام دیکھ کر ہمیں غالب اور اکبر یاد آ گئے غالب فرماتے ہیں:-

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

اور اکبر نے کسی پنجابی مصنف الف دین کو لکھا تھا:-

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کہ بے دین نے پائی راہِ صواب

سوال یہ ہے کہ اگر اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے تو ابجد کے کون سے حروف لئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ب سے ابے تبے کا خیال آئے گا۔ ث، ڈ، ژ کو بھلا کون پسند کرے گا، لیکن ج، د، س، ص، ع، ق، ک، ل، م، ن میں سے کوئی حرف ضرور پسند کیا جا سکتا ہے۔ ہم ع اور س کی سفارش کریں گے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

ناموں پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ عرصہ ہوا رشید احمد صدیقی کے چند ادبی خاکوں کا مجموعہ "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے شائع ہوا اس پر ایک رسالے کے ریویو نگار نے لکھا کہ کتاب کا نام دیکھ کر اسے کسی دفینے یا سونے کی کان کا خیال آیا۔ عجب ہے کہ اس نے غالب کے اس شعر کو نظر انداز کر دیا جو کتاب کے چھپے ٹائٹل پر لکھا ہوا تھا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

بہرحال اب تک مختصر ترین نام کا ریکارڈ رئیس امروہوی کا ہے اور طویل ترین نام کا آنند نرائن مُلّا کا جن کا تازہ مجموعہ "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" حال میں شائع ہوا ہے۔ دیکھنا ہے یہ ریکارڈ کون توڑتا ہے۔

ریاستی انجمن کا دفتر

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ اور اُتر پردیش کا دفتر جلسۂ تہذیب لائبریری (رفاہ عام کلب) گولا گنج لکھنؤ میں قائم کر دیا گیا ہے۔ گرمیوں میں فی الحال دفتر کے اوقات صبح ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک اور شام ۵ بجے سے ۸ بجے تک رہیں گے۔ ریاستی انجمن کی جدید تنظیم اور شاخوں کے قیام کے سلسلے میں جملہ خط و کتابت اسی پتے پر کی جائے۔

(قومی آواز۔ لکھنؤ)

عبدالحق میموریل لیکچرز

انجمن ترقی اُردو بمبئی نے طے کیا ہے کہ وہ ہر سال عبدالحق میموریل لیکچرز کا ایک پروگرام ترتیب دیا کرے گی جس میں ملک کے چوٹی کے ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی جائے گی۔

اسی سال ان لیکچروں کا آغاز ہوگا۔ انجمن کی دعوت پر ملک کے ممتاز ادیب نقاد اور انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور اس پروگرام کے تحت "فن اور فنکار" کے موضوع پر تین لیکچر دیں گے۔ تاریخوں کا اعلان بعد میں ہوگا۔

رامائن کشمیری زبان میں

معلوم ہوا ہے کہ کشمیر کے ایک عالم تلسی داس کی رامائن کا کشمیری زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں ڈوگری زبان میں رامائن کا ترجمہ پہلے ہی چھپ چکا ہے۔

(روزنامہ مسلمان مدراس)

تصحیح

۸ر مئی کے "ہماری زبان" میں صفحہ ۲ پر "استفسار" کے عنوان کے نیچے پہلی سطر میں "ولادت" کے بجائے "ولایت" چھپ گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

سید یحییٰ امام

یحییٰ لائبریری کی نایاب مطبوعہ کتابیں

سدا سہاگ

یہ کتاب ۹۲ صفحوں کی نثر و نظم میں ہے۔ اس کو مرزا نصیر الدین محمد تحصیلدار و ڈپٹی مجسٹریٹ نجیب آباد ضلع بجنور نے تصنیف کیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ماہ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں مطبع نول کشور کانپور میں طبع ہوئی۔ سرورق کے بعد پہلے صفحہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"کتاب سدا سہاگ نثر و نظم درباب تعلیم نسواں مرزا نصیر الدین محمد تحصیلدار نجیب آباد ضلع بجنور نے بموجب ارشاد عام مندرجہ اشتہار مطبوعہ گزٹ ۱۸۶۶ء حکم سے جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی تصنیف کیے"۔

اس کتاب پر مصنف کو سرکار (گورنمنٹ) سے انعام عطا ہوا اور علاوہ انعام کے ۱۰۰ جلد اس کتاب کی گورنمنٹ نے مدارس نسواں کے لئے خرید کی۔

یہ کتاب تین ابواب میں تقسیم کی گئی ہے:۔

پہلا باب ۔۔ بیٹیوں کے مباحثے میں تعلیم کے فوائد پر ہے۔

دوسرا باب ۔ اس باب میں بارہ خطوط ہیں جن میں کہ علم کے فوائد اور خانہ داری کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

تیسرا باب منظوم ہے۔ اول مصنف کی مناجات ہے پھر ایک لڑکی زبیدہ کا تذکرہ ہے اس کے بعد دعا سلامتی ملکہ کشورہ ہے اور آخر میں دعا بحق سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر ہے۔

تاریخی نام اس کتاب کا "قسمت کا ستارہ" (۱۲۸۵) ہے۔

تسہیل ستار

خوش ستار پر یہ کتاب مرزا رحیم بیگ ساکن شہر خیرآباد ضلع لکھنؤ نے ۱۸۷۰ء میں بمقام لاہور مرتب کی۔ یہ کتاب ۱۰۲ صفحوں کی مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ستار کے فن پر ہے۔ مصنف نے بہت واضح طرح پر سیکڑوں نقشے بنا کر اس فن کے سیکھنے میں سہولت دی ہے۔ ۱۸۷۰ء کے قبل بھی دو اور کتابیں اس فن پر ایک او جاگر مل نے میرٹھ میں اور دوسری محمد حسین خاں نے دہلی میں طبع کرائی تھی۔

کشف الاسرار

یہ کتاب ۲۰۶ صفحوں کی ہے۔ یہ مطبع نول کشور لکھنؤ میں طبع ہوئی۔ سنہ تاریخ کتاب کے ناقص ہونے کی وجہ سے دریافت نہ ہو سکا۔

خاتمۃ المطبع از جانب کار پردازان مطبع:۔

"علم اخلاق و تصوف میں رسالہ "مئی باچشتیہ" مصنفہ محمد علی رفعت نہایت مختصر و جامع تھا لیکن عبارت فارسی کی وجہ سے اکثر صاحبان کم مایہ بالخصوص اطفال اس رسالہ سے فائدہ اٹھانے سے محروم تھے۔ بفضلہ تعالیٰ یہ دقت بھی دور ہو گئی اور جناب معلی القاب عندلیب گلستان فصاحت طوطی شکرستان بلاغت سخندان سخن ور راجہ رمیشور راؤ احمد خلف راجہ اومابت راؤ مہا بلونت بہادر رستیان دوگنڈہ نے اس رسالہ کا ترجمہ بزبان اردو عام فہم نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے فرمایا اور نام اس کا "کشف الاسرار" رکھا۔"

سراپائی پیری (منظوم)

یہ کتاب ۲۰ صفحوں میں مطبع نول کشور میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے آخر صفحہ کے آخر کا حصہ دیمک خوردہ ہے اس وجہ سے مصنف کا صرف تخلص "اویس بلگرامی" نظر آتا ہے۔ سنہ میں صرف ۱۸۹ نمایاں ہے باقی دیمک کی نذر ہو گیا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

اچھی کوشش بیو کٹی کے پیری باقی ہو — گر شیر ہو تو صورت روباہ باقی ہو
رہیں نہ قوتوں کی تمام طاقت لاقی ہو — آتی ہو یہ تو بس جان کو لیکے جاتی ہو

یارب برا ہو پیری تمام خراب کا
محتاج بال بال ہوا ہے خضاب کا

رسالۂ جامع الفوائد

یہ کتاب ۱۲ صفحوں میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں سنہ ۱۸۹۱ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف کرنل ایس۔ ای۔ ہیٹ گشتہ سپرنٹنڈنٹ قسمت لکھنؤ تھے۔ اس کتاب کے سرورق کے بعد ایک صفحہ پر انگریزی میں اس کتاب کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔ سرورق پر حسب ذیل عبارت ہے:

"رسالۂ جامع الفوائد جس میں ہجریوں کو انگریزی سے انگریزی کو ہجریوں سے باسانی دریافت کر لینے کی جنتری اور ان سنین عام کا بیان دستاویزوں کی اسٹامپ کی تشریح ڈاک کی قواعد وغیرہ"

قواعد منی لعل

اس کتاب کے مصنف ماسٹر منی لال بلگرامی ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول ضلع سیتاپور تھے۔ یہ کتاب مطبع نول کشور لکھنؤ میں ۱۸۷۸ء میں طبع ہوئی۔

یہ کتاب میرے پاس صرف ۴۸ صفحوں میں ہے اور آخر عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک ورق غائب ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایک مفید کتاب ہے اور اگر اس کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو شاید بہت سی معمولی غلطیاں جو اردو دانوں سے عام طور پر ہو جاتی ہیں وہ نہ ہوں۔

حکایات نایاب مسمی بہ انشائے نورتن

یہ کتاب ۱۹۲ صفحوں کی ہے اس کے مصنف [illegible] تھے۔ یہ ماہ جولائی ۱۸۷۳ء میں مطبع "شعلۂ طور" کانپور میں طبع ہوئی۔ یہ کتاب نو ابواب میں بہت سی نادر اور لاجواب حکایات کا مجموعہ ہے۔

محمد انصار اللہ نظر

دیوان شاہ نیاز (قلمی)

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز کا زمانہ کم و بیش وہی ہے جو انشا اور مصحفی کا ہے، یہ چشتیہ اور قادریہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ ان کے والد حاجی حکیم شاہ رحمت اللہ سرہند کے رہنے والے تھے، دہلی میں شاہ نیاز احمد بھی پیدا ہوئے۔ صحیح زمانۂ ولادت معلوم نہیں البتہ قیاس کہتا ہے کہ ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ذہانت خداداد تھی چنانچہ سترہ سال کی عمر میں علم ظاہری کی تکمیل کی، بیس سال کی عمر میں حضرت مولانا محمد فخر الدین قدس سرہٗ سے بیعت کی۔ اپنے مرشد کے حکم سے بانس بریلی تشریف لائے پھر رامپور گئے وہاں حضرت غوث الاعظمؒ کے فرزند شاہ عبد اللہ صاحب بغدادی کے دست مبارک پر بیعت کرکے سلسلۂ قادریہ میں داخل ہوئے۔ بانس بریلی میں ۸۸ سال کی عمر میں ۶ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ میں وصال ہوا۔ اکثر غزلوں میں حضرت غوث الاعظم سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

شاہ نیاز صاحب کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور دونوں زبانوں میں صاحب دیوان ہوئے، شاہ صاحب کا دیوان ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے، جون ۱۹۰۸ء میں مطبع نول کشور سے ساتواں بار شائع ہوا۔ خاتمہ کی عبارت یہ ہے:-

> مژدہ جان فزا بہ نیاز مندان حضرت [illegible] ... یعنی دیوان فارسی
> و اردو جناب شاہ نیاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مطبع
> منشی نول کشور واقع لکھنؤ بماہ جون ۱۹۰۸ عیسوی
> بار ہفتم [illegible] (ہفتم)

مطبع نول کشور کے علاوہ دوسرے مطابع بھی اسے شائع کرتے تھے چنانچہ لالہ منشی [illegible] تاجر کتب مالک مطبع مجتبائی پریس آگرہ نے بھی اسے چھپوا کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ اس دیوان کے قلمی نسخے بھی لوگوں کے پاس محفوظ تھے۔ تذکرۂ نادر میں ان کا ذکر اس طرح ملتا ہے:-

"نیاز شاہ نیاز احمد خلف حاجی رحمت اللہ متوطن بریلی (حاشیہ)"

خوش قسمتی سے دیوان نیاز کا ایک قلمی نسخہ ہمیں دستیاب ہو گیا ہے۔ نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے اور اچھی حالت میں ہے دیوان اردو مکمل ہے البتہ دیوان فارسی ناقص الآخر ہے، دیوان اردو کے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:-

> "تمت تمام شد بعون [illegible] تمام شد این دیوان تصنیف
> حضرت مولانا [illegible] مخدومنا شاہ نیاز احمد [illegible] نیاز صاحب
> از خط بدخط شیخ محمد فصاحت علی برائے خاطر [illegible] اعظم علی
> مرقومہ [illegible] ۱۲۴۹ مطابق بست چہارم ماہ صفر ۱۲۶۵ ہجری"

اعظم علی کون تھے؟ اس کا علم نہیں البتہ جلد سے متعلق ایک سادہ صفحہ پر بطور یادداشت یہ عبارت کسی نے لکھی ہوئی ہے [illegible] اعظم علی کا نام [illegible]

> "[illegible] بمقام لکھنؤ کارخانہ مولوی ابراہیم صاحب
> میں مل سکتی ہے محمد اعظم علی کی آنکھوں کی"

میرا خیال ہے کہ اعظم علی کسی مولوی ابراہیم صاحب کے کارخانہ کے مہتمم یا کوئی اور ذمہ دار حیثیت رکھتے ہوں گے اور اغلب ہے کہ یہ کارخانہ کوئی مطبع ہو۔ مطبع والوں نے چھاپنے کے لئے فصاحت علی سے دیوان مذکور کی نقل کرائی ہو۔ مخطوطہ کے موجودہ مالک جناب عبد الرشید صاحب دبیر منزل کانپور بھی میرے اس قیاس سے متفق ہیں اور موصوف کا خیال یہ بھی ہے کہ مطبع نول کشور کانپور نے بھی اسی مخطوطہ کو دیوان کی طباعت کے لئے استعمال کیا ہو گا۔ مخطوطہ کا کاغذ نہایت عمدہ سفید ہے، صفحات کا شمار کسی نے بعد میں کیا ہے، خط تحریر مختلف ہے، سائز ۶×۹ ہے۔ اردو دیوان کی ضخامت ۹۴ صفحات ہے، کاتب خوشخط ضرور ہے لیکن املا کی غلطیاں اس کی بد احتیاطی پر دال ہیں مثلاً نادی کو نادی، گلزار کو گلذار وغیرہ لکھا ہے۔

شاہ نیاز کی زبان وہی ہے جو اس دور میں عام طور پر رائج رہی ہو گی، چنانچہ متروکات بکثرت ہیں، میر اور سودا سے کچھ زیادہ ہیں وجہ شاید یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زبان عوامی ہے، علمی و ادبی نہیں چنانچہ بعض الفاظ یوں نظم کئے ہیں:-

> نط، پیارا، سنگ (بمعنی ساتھ) تھور، کنہ، و عشنا
> بڑنا، بھونچک، تڑنا (تھمنا) آندی (آندھی) نکاس
> باجنا (بجنا)، کونج (کوچ)، پوڑ (چھوڑتی) دیکھن ہارا
> (دیکھنے والو)

الفاظ کی توڑ مروڑ اس حد تک ہے کہ بعض مصرعے ناموزوں معلوم ہوتے ہیں مثلاً

(باقی صفحہ ۱ پر)

غـــزلیں

ریورنڈ ہیلسن ریحانی

مری آنکھوں سے اشکِ خوں نکل کے
بنے لالہ و گل زمینِ غــزل کے

جو اس نے مجھے غم کی دولت عطا کی
تو اہلِ ہوس رہ گئے ہاتھ مل کے

ہر اک گام پر فتنۂ دیر و حرم کا
کہاں آ گئے اس گلی سے نکل کے

ہے آغوشِ موج ان کو آغوشِ جاناں
جوانی کو پہنچے جو طوفاں میں پل کے

ستاروں کی جانب اڑا جا رہا ہے
یہ انساں قوانینِ فطرت بدل کے

سیاست کے ماہر تو بنتے ہیں لیکن
تقاضے سمجھتے نہیں آج کل کے

ہے ریحانی اس وقت کیفِ بہاراں
کہ ہر تشنہ لب کے لئے جام چھلکے

احسن جعفری

پیراہنِ رنگیں ہے نہ خوشبوئے حنا ہے
سونی سی بہت شہرِ تمنا کی فضا ہے

مہکا ہوا ہے صورتِ گل آج بھی ہمدم
وہ زخم جو دل کو تری نظروں سے ملا ہے

دکھلائیں کسے جا کے دلِ زار کا عالم
ہر لمحہ ترے درد کی آنچوں میں تپا ہے

کیا جانیے وہ کون سا تھا قرب کا لمحہ
جو ہجر کے ہاتھوں میں مجھے سونپ گیا ہے

احسن نہ ہوا تیرگیِ راہ کا احساس
لمحوں کے اجالوں میں سفر ہم نے کیا ہے

قطعات

تارا چند باغی

اپنا مطلب نکالنے والے اپنا مطلب نکال لیتے ہیں
وہ جو مرتا نہیں عداوت سے اس کو احساں سے مار دیتے ہیں

جب غریبوں کی جان لینے کو پیار کا ایک بول کافی ہے
زہر دینا پھر ان کو نفرت کا سر بسر عقل کے منافی ہے

اے دلِ زار اس زمانے میں کون پُرسانِ حال ہوتا ہے
جس سے جا کر سوال کرتے ہیں خود مجسّم سوال ہوتا ہے

سہ لسانی فارمولا

ایک ممبر کے اس سوال پر کہ مختلف ریاستوں میں لسانی فارمولے پر عملدرآمد کی رفتار کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے نائب وزیر تعلیم مسز راما چندرن نے لوک سبھا میں بتایا کہ غیر ہندی ریاستوں کے تقریباً تمام اسکولوں میں اس فارمولے پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے اور ان اسکولوں میں ہندی کو لازمی مضمون کر دیا گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ جنوبی ہند کی جن ریاستوں میں اب تک اس فارمولے پر عمل درآمد نہیں ہو سکا تھا اُن کو ہندی کے استادوں کے تقرر کے لئے مرکزی حکومت نے سو فی صدی مدد کی پیشکش کی تھی۔

انھوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ بہار، اُتر پردیش راجستھان اور مدھیہ پردیش کے بعض اسکولوں میں غیر ہندی زبانیں پڑھائی جا رہی ہیں یا نہیں؟

نائب وزیر تعلیم نے کہا کہ حکومت کچھ ایسی تجویزوں کو آخری شکل دے رہی ہے جن کی رو سے ہندی ریاستوں کے اسکولوں میں غیر ہندی زبانیں پڑھائی جا سکیں گی۔ اب تک ان ریاستوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ سنسکرت کلاسیکی زبان ہے اس لئے اس کی بجائے تیسری زبان کی حیثیت سے جنوبی ہند کی کوئی زبان پڑھائی جانی چاہیے۔

غیر ہندی ریاستوں کے کچھ ممبروں نے شکایت کی کہ صرف غیر ہندی ریاستوں ہی میں سہ لسانی فارمولے پر آزمائش کے طور پر پورے خلوص سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔

پی ایس پی ممبر شری ناتھ پائی نے بھی ان ممبران کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ غیر ہندی ریاستوں میں ہی اس فارمولے پر صحیح طریقے پر عمل ہو رہا ہے اور ہندی ریاستیں اس بہانے کہ ہمارے اسکولوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت پڑھائی جا رہی ہے اس فارمولے پر عمل کرنے سے بچنا چاہتی ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز)

ہندی اساتذہ کی تنخواہ

نائب وزیر تعلیم مسٹر بھگت ورشن نے لوک سبھا میں بتایا کہ آئندہ سے صوبائی اسکولوں میں ہندی پڑھانے والے اُستادوں کی مکمل تنخواہ مرکزی حکومت ادا کرے گی۔ (روزنامہ مسلمان مدراس)

اُردو کے لئے ہم کیا کریں

پنڈت آنند نرائن مُلّا کی تقریر

۲۶ اپریل ۱۹۶۳ء کو جامعہ اُردو علی گڑھ کے تقسیم اسناد کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت آنند نرائن مُلّا نے کہا کہ شاید آپ سب یہ تسلیم کریں گے کہ آج اُردو کی ترقی تو درکنار اُردو کی بقا بھی خطرے میں ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ محبان اُردو متفق اور منظم ہو کر مخالف قوتوں کا مقابلہ کریں کیونکہ اگر اس وقت یہ لڑائی نہ لڑی گئی تو پھر کبھی نہ لڑی جا سکے گی، اور تاریخ ہماری مثال پیش کرے گی کہ جب کسی گروہ میں ہمّت اور غیرت نہیں رہتی اُس وقت اس کا مضبوط سے مضبوط اور جائز سے جائز حق بھی آسانی سے ٹھکرایا جا سکتا ہے کیونکہ دنیا صرف زندہ انسانوں کے حقوق کی پاسداری کرتی ہے اور مُردوں کا صرف دو گز زمین میں دفن ہونے کے علاوہ اور کوئی حق نہیں ہوتا۔

مُلّا صاحب نے آگے چل کر فرمایا کہ آج اُردو ایک نازک دور سے گزر رہی ہے۔ محبان اُردو کی غفلت اور کوتاہی عمل اس نزاکت کو اور بھی بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم خطرات سے پورے طور پر آگاہ نہیں۔ ہم کچھ غیر اہم چیزوں کا غلط اثر لیتے ہیں اور اہم چیزیں بھول جاتے ہیں۔ بظاہر مشاعرے اُسی افراط سے ہوتے ہیں جیسے پہلے ہوتے تھے۔ اُردو کے رسائل اور اخبارات کی تعداد پہلے سے کچھ زائد ہی ہو گئی ہے اور جو زبان کہ شہروں اور قصبوں میں آج بولی جاتی ہے اس میں ابھی تک کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ حکومت کے ذمہ دار افراد جب لسانی معاملات پر کوئی تقریر کرتے ہیں تو اُردو کے حق میں بھی دو چار کلمۂ خیر فرما دیتے ہیں۔ جو لوگ تصویر کے اس رُخ کو ضرورت سے زائد اہمیت دیتے ہیں وہ اپنی خواہشوں کے فریب میں مبتلا ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ رفتہ رفتہ حالات خود بخود درست (اصلاح) ہو جائیں گے اور اُردو پھر اپنا جائز مقام حاصل کرے گی، اور وہ خوشنما نقاب کے حسن میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور ہندی سامراجیت کا وہ خوفناک چہرہ جو اس نقاب میں پوشیدہ ہے ان کو نظر نہیں آتا۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ خود ان کی اولاد اپنی مادری زبان میں تعلیم پا رہی ہے یا نہیں۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں وہ اپنی مادری زبان میں عذر خواہی کر سکتے ہیں یا نہیں" اور خود اپنے ہی وطن میں وہ بغیر ایک دوسری زبان کا سہارا لئے ہوئے اسٹیشنوں اور سڑکوں کا نام بھی پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی زبان کو مٹانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے زبان کی سطح سے گرا کر ایک بولی کی سطح پر لایا جائے اور پھر اُسے کسی دوسری زبان میں جذب کر لیا جائے۔ اُردو بولنے والے آج بھی کم نہیں ہیں لیکن اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد تیزی کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسی زبان کی بقا کے ضامن بولنے والے نہیں ہوتے بلکہ لکھنے پڑھنے والے ہوتے ہیں کیونکہ زبان تخلیقی ادب کے سہارے جیتی ہے اور محض ایک بولی بولنے والے زبان کو تخلیقی ادب نہیں دے سکتے۔ آج کچھ حلقوں میں سنجیدگی سے یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ قومی یک جہتی حاصل کرنے کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ اُردو ہندی رسم الخط اختیار کرے۔ جو لوگ نیک نیتی سے یہ رائے دیتے ہیں وہ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ زبان اور رسم الخط کا رشتہ جسم اور پوشاک کا نہیں جو آسانی سے اتاری جائے بلکہ جسم اور کھال کا ہے جو جسم کا رنگ بھی متعین کرتی ہے اور اس کی ساخت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔۔۔ اُردو رسم الخط نے اُردو زبان کا اس کی تمام ارتقائی منازل میں ساتھ دیا ہے اور اب یہ دونوں اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے علاوہ اس تجویز کے حامی شاید یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اُردو خالی اس ملک کی زبان نہیں بلکہ ایک پڑوسی ملک کی بھی زبان ہے اور خود اپنے ہی ملک میں ایک ریاست کی سرکاری زبان ہے کیا کوئی سنجیدہ ذہن یہ قبول کر سکتا ہے کہ ایک ہی زبان کا رسم الخط ایک ملک میں ایک ہو اور دوسرے ملک میں بلکہ اسی ملک کے ایک دوسرے حصّہ میں دوسرا ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو لوگ اس قسم کی تجویزیں پیش کرتے ہیں اُن کے ذہنوں میں قومی یک جہتی کا تصور عجیب عجیب قسم کے سایوں اور دھندلکوں کو تشکیل دیتا ہے اور ہندی رسم الخط کو عام بنانے کا جذبہ ان کے دلوں میں اس حد تک گھر کر چکا ہے کہ وہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے کسی دوسری زبان کو جان بوجھ کر مٹانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ کیا قومی یک جہتی انصاف کا خون کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ سامراجی نقطۂ نظر ہو لیکن قومی یک جہتی کے اس تصور کی جمہوریت میں کوئی جگہ نہیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے قومی یک جہتی نہ ہونا منظور ہے لیکن اس قسم کی قومی یک جہتی منظور نہیں کیونکہ میں جمہوریت کو سامراجیت پر قربان نہیں کر سکتا۔ میں ہندی کو اپنے ملک کی سب سے بڑی زبان تسلیم کرتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہر شخص یہ زبان سیکھے تاکہ ایک روز یہ ہماری قومی زبان بن سکے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر حکومت اپنے ناجائز احکامات سے ہندی کی غلط تبلیغ کی کوشش نہ کرے تو شاید پچیس تیس سال میں ہندی کو یہ مقام مل جائے۔ لیکن بد قسمتی ہے کہ حکومت عوام کو خود اپنی

ہند کی زبان بنانے کا موقع دینے کو تیار نہیں بلکہ لسانی سامراجیت کے جذبہ کے تحت وہ صرف ایک بے جان اور مصنوعی زبان ان کو سکھانا چاہتی ہے۔ یہ کہنے کے لئے کہ یہ کوشش ناکامیاب رہے گی کسی بڑے دانشور سے رائے لینے کی ضرورت نہیں۔ ہماری ریاستی حکومت تخت مغلیہ کے وارثوں کی طرح صرف ایک اصول پر کاربند ہے، اور وہ یہ کہ تخت پر قبضہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے سب بھائیوں اور عزیزوں کو قتل کر دیا جائے۔ یہ جئے تو اپنی ریاستی حکومت کی اردو دشمنی کی تہ میں یہی نفسیاتی حقیقت نظر آتی ہے۔

اردو کے معاملے میں مرکزی حکومت کے غیر واضح طرزِ عمل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مُلّا صاحب نے فرمایا۔ جب تک مرکزی حکومت لسانی معاملات میں صوبائی حکومتوں کی مکمل خود مختاری پر نظرِ ثانی نہیں کرے گی اُس وقت تک مرکز کی ہمدردی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ جن بنیادی حقوق کا تحفظ آئین میں کیا گیا ہے اُن کو زائل کرنے کی تر غیبات تو مرکزی حکومت بڑی آسانی سے پیش کر رہی ہے لیکن ان بنیادی حقوق کے کچلنے والوں کے خلاف یہ اس قدر آئین کی پابند ہو جاتی ہے کہ اُن کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ ممکن ہے اور لوگوں کی رائے مختلف ہو لیکن میرا یہ خیال ہے کہ آسمان پر تو انصاف ہے، زمین کے جبر کا شکار اپنی رضامندی سے بٹنے کو تیار نہیں۔ اگر بڑا بھائی اپنے چھوٹے بد دماغ بھائی کو تلوار چلانے سے نہیں روک سکتا تو یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ اُس کے ہاتھوں سے تلوار چھین لیں، چاہے اس میں ہمارے جسم پر کچھ زخم بھی آئیں۔ میں سب محبانِ اُردو سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ ریاستی حکومت کے سامنے اپنے جائز مطالبات پیش تو ضرور کریں اور ہر آئینی چارہ جوئی پر بھی نظر رکھیں لیکن اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے خالی انھیں ذریعوں پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے عوام سے رشتے قائم کر کے کوئی اور طریقہ بھی سوچیں۔

یہ اور طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ مجھے تو دو راستے نظر آتے ہیں۔ ایک راستہ دیوانگی کا ہے اور ایک ہوش مندی کا۔ میرا جتنا بھی تاریخِ انسان کا مطالعہ ہے وہ مجھے یہی بتاتا ہے کہ دیوانگی نے جیسا اوقات لوگوں کے جذبات کو برافروختہ کر کے کسی دشوار گزار منزل کی طرف گامزن ہونے کے لئے آمادہ تو ضرور کر دیا ہے لیکن محض دیوانگی کسی قافلے کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ منزلِ مقصود تک تو ان باعقل ہوشمندوں کا قافلہ ہی پہنچتا ہے جو دیوانگی کی دکھائی ہوئی راہ پر بعد کو اپنی صفیں منظم کر کے اور عزم محکم سے کر آگے بڑھتا ہے۔ کسی سخت منزل تک پہنچنے کا سفر کبھی اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ اُسے صرف ایک شعلۂ مستعجل کی روشنی میں طے کر لیا جائے۔ اس کے لئے ایک شعلۂ دیرپا کی ضرورت ہوتی ہے اور دیوانگی یہ شعلۂ دیرپا مہیا نہیں کر سکتی۔ آج میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری ریاستی حکومت کی لسانی جبر کی پالیسی اکثر محبانِ اُردو کے دلوں میں اتنی شدید مایوسی پیدا کر رہی ہے کہ وہ اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے دیوانگی کے راستے پر بھی چلنے کو آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ جو لوگ کہ کاروانِ اُردو کے رہنما ہیں آج ان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ عوام کے ان جذبات کی قدر کریں اور انھیں ایک منظم عملی تحریک میں حصہ لینے کی دعوت دے کر ان کے جوش اور ولولے کو ایک صحیح راستہ دکھائیں اور اس طرح انھیں دیوانگی کی راہوں پر بھٹکنے سے روکیں۔ ابھی یہ دیوانگی محض غم اور مایوسی کی دیوانگی ہے ان دلوں کی دیوانگی نہیں جن میں نفرت اپنا گھر بنا چکی ہے۔ لیکن مجھے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر ہم نے عوام کے جذبات کو عملی جامہ نہ پہنایا تو ہم یقیناً اُن کا اعتبار کھو دیں گے اور ایسی صورت میں قصور اپنا ہوگا عوام کا نہیں۔

مُلّا صاحب نے اُردو دوستوں کو مشورہ دیا کہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی حق کے مطالبہ کے لئے اچھی فضا کا بننا محض حق کی درستی اور مضبوطی پر کبھی نہیں ہوتا بلکہ بہت کچھ اس پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ حق مانگنے والا اپنا حق کس انداز سے مانگتا ہے اور وہ اس حق کے علاوہ اور معاملات میں ہمارا دوست یا ساتھی ہے یا نہیں۔ ہمارا ملک ایک غیر مذہبی سلطنت ہے اور میرے نزدیک جو لوگ اُردو کے سوال کو کسی مذہب یا فرقے کے حقوق میں شامل کرنا چاہتے ہیں وہ خود اُردو کے ساتھ انصاف کرنے کو تیار نہیں۔ اُردو کی تصویر جو میری نظروں میں اُبھرتی ہے وہ اس مقدس بزرگ کی نہیں جس کے ماتھے پر سجدے کے نشان ہیں، جس کے ہاتھوں میں تسبیح ہے اور جس کے ہونٹوں پر نعرۂ تکبیر ہے بلکہ وہ اس حسینہ کی ہے جس کی پیشانی پر اپنے وطن کی خاک کے ذروں کی افشاں ہے، جس کے ہاتھوں میں اپنے ہی دیس کے پھولوں کے رنگ برنگے گلدستے ہیں اور جس کے ہونٹوں پر قومی یک جہتی کا ترانہ ہے۔ میرے نزدیک اُردو قومی یک جہتی کا عظیم الشان کارنامہ ہے اور یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اپنی اپنی جگہ لوگوں کو اس حقیقت سے آشنا کیجئے اور اگر دلوں میں کچھ شکوک ہیں تو ان کو اپنے خلوص اور عمل سے دور کیجئے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو مجھے کوئی شک نہیں کہ اُردو کے لئے ایک

سازگار فضا تیار ہو جائے گی۔ ....

آخر میں ملا صاحب نے فرمایا کہ اُردو کو اپنی بقا کے لئے کم سے کم تین محاذوں پر لڑنا ہے۔ اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے ملا صاحب نے ایک مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر کسی شہر میں کسی بجلی گھر کا کوئی بدنیت یا نادان افسر ایک لائن کاٹ دے جس سے بہت سے گھر بے نور ہو جائیں تو ایسی صورت میں ان لوگوں کو جن کے گھروں میں اس ظالمانہ اور ناجائز کارروائی سے اندھیرا ہو گیا ہے کیا کرنا چاہیئے۔ کچھ لوگ تو یہ مشورہ دیں گے کہ سب لاٹھیاں لے کر نکل پڑیں اور بجلی گھر کے افسر پر حملہ کر دیں میرے نزدیک یہ دیوانگی ہوگی کیونکہ کوئی نزاع اس طرح حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ اس قسم کا حربۂ مظلوم کا وہ حربۂ آخری ہوتا ہے جب اور سب دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں تو اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ ایک دوسرا گروہ غم و غصہ کا تو پر جوش اظہار کرے گا لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے سے گریز کرے گا۔ یہ گروہ خالی شکست خوردہ ذہنیت ہی نہیں رکھتا بلکہ بد دیانت بھی ہے کیونکہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی قربانی کرنے کو تیار نہیں لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے حق کے لئے لڑیں اور وہ خود افسر کی خوشامد کرے اور اس طرح کچھ ذاتی فائدہ حاصل کرے۔ یہ دونوں گروہ اندھیرا دور کرنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ لیکن ایک تیسرا گروہ ہے جو تاریکی مٹانے کے لئے تین باتیں کرے گا۔ سب سے پہلے تو وہ ایک سمجھدار انسان کی طرح اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اندھیرے کو کوسنے سے کہیں زائد بہتر یہ ہے کہ گھر میں چراغ جلا لئے جائیں وہ اندھیری بستی میں جتنے بھی چراغ جلا سکے گا جلائیگا میں آج سند پانے والوں سے یہی کہوں گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چراغ جلانے کو اپنا فرض اولین سمجھیں۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد کم نہ ہو اور اس کے لئے اگر مدارس شبینہ بھی قائم کرنا پڑیں تو ایثار کر کے ایسا ضرور کیا جائے۔ دوسری بات جو ایک ہوشمند انسان کریگا وہ یہ ہے کہ اپنا دکھ درد پڑوسیوں سے اس طرح بیان کریگا کہ وہ اس کے درد کا اثر لیں اور اُسے ایک پڑوسی کی ہمدردی دیں۔ وہ تلخ زبانی کے بجائے نرم زبانی سے کام لے گا۔ پڑوسیوں میں بہت سے انصاف پسند بھی ہوں گے اور وہ اس کے درد کو سمجھیں گے۔ اس طرح اس کی طاقت بڑھے گی۔ تیسری بات وہ یہ کرے گا کہ افسر سے کھلے الفاظ میں لائن پھر سے درست کرنے کا احتجاج کرے گا اور اگر افسر اس پر تیار نہ ہو تو پہلے وہ ہر آئینی طریقہ افسر کا حکم بدلوانے کے لئے اختیار کرے گا۔ لیکن اگر کسی طور بھی کامیابی حاصل نہ ہو تب وہ اپنے پورے گروہ کو ساتھ لے کر اپنے سارے جمہوری حقوق افسر کو تبدیل کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔

شاید اس مثال سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اُردو کو کن تین محاذوں پر اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ میرے نزدیک پہلا محاذ سب میں زیادہ اہم ہے۔ اور اگر اس محاذ پر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو اور دونوں محاذوں پر ہماری کامیابی لازمی ہے۔

اُردو میں پی ایچ ڈی

آگرہ یونیورسٹی نے جناب ابو محمد سحر اسسٹنٹ پروفیسر اُردو ٹی آر ایس کالج ریوا کو اُن کے مقالے "اُردو ادب میں امیر مینائی کا حصّہ" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ابو محمد سحر "اُردو میں قصیدہ نگاری" اور "تنقید و تجزیہ" جیسی قابل قدر کتابوں کے مصنف ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے راہی معصوم رضا لیکچرر شعبۂ اُردو کو اُن کے مقالے "طلسم ہوش رُبا میں ہندوستانی زندگی کا عکس" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ راہی معصوم رضا اُردو کے نوجوان شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور ۱۸۵۷ء پر انہوں نے ایک طویل نظم لکھی ہے جو کتابی صورت میں شایع ہو چکی ہے۔

انجمن کی نئی دہلی شاخ کا قیام

۳ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو بیگم انیس قدوائی ایم پی کی صدارت میں ۱۲۔ ونڈسر پلیس میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں نئی دہلی شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ حسب ذیل عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔

صدر۔ بیگم انیس قدوائی ایم پی، نائب صدر۔ جناب رنبیر ایڈیٹر روزنامہ ملاپ، جناب روش صدیقی صاحب، جنرل سکریٹری جناب شاہ مصباح الدین شکیل، جوائنٹ سکریٹری۔ پنڈت رتن موہن زتشی خار دہلوی، خازن۔ جناب احمد مہدی ایم۔ پی،

اراکین عاملہ:-

جناب اجمل خاں صاحب ایم۔ پی، جناب سید علی جواد صاحب زیدی، جناب اطہر حسین صاحب، جناب سید حامد صاحب، سردار گوردیال سنگھ ایڈوکیٹ، بیگم نسیم چشتی، جناب گوربچن چندن صاحب، جناب جگن ناتھ صاحب آزاد، جناب رئیس مرزا صاحب، جناب جگدیش چندر صاحب، بیگم قدیر۔

(جنرل سکریٹری)

قرآن کا اُردو ترجمہ: ایک مشکل، ایک حل

اسلام کے تعلق سے اُردو میں بہت بڑی شان دار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن جہاں تک قرآن کے اُردو ترجمہ کا تعلق ہے کہنا چاہئے، یہ کام ہوا ہی نہیں۔ یوں تو آپ کو بیسیوں ایک درجن تراجم مل جائیں گے، لیکن صحیح معنوں میں دیکھئے تو ایک بھی ترجمہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اصل عربی قرآن سے کوئی بھی بے نیاز نہیں کراتا۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

سورہ فاتحہ کی پہلی آیت لے لیجئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔ شاہ عبدالقادرؒ ترجمہ کرتے ہیں۔ "سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا"۔ یہ ترجمہ اصل عبارت سے بے نیاز نہیں کرتا۔ ترجمہ کی تفسیر کچھ اور ہوگی، اصل کچھ اور۔ لیکن شاہ صاحبؒ کو ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔ اس زمانے میں اُردو میں ترجمہ کرنے کا مطلب تھا، مسلمانوں کے اس طبقے کے لئے جو عربی فارسی سے بالکل ناآشنا تھا، عام زبان میں موٹا سا ترجمہ پیش کر دینا۔

شیخ الہندؒ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ "سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا"۔ اسے بھی میں صحیح ترجمہ نہیں مانتا۔ "حمد" کا ترجمہ "تعریفیں" اور "رب" کا ترجمہ "پالنے والا" ناکافی ہیں۔ مزید، "عالمین" کو "سارے جہان" میں آپ کیسے سمو سکتے ہیں؟

مولانا تھانویؒ ترجمہ کرتے ہیں۔ "سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے"۔ کیا اُردو کا "مربی" عربی کے "رب" کے مفہوم کی ادائی کی قوت رکھتا ہے؟

ابوالکلام آزادؒ نے تو سب سے زیادہ غلطیاں کی ہیں۔ ترجمے ہیں۔ "ہر طرح کی ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے"۔ عربی "حمد" کے لئے "ستائش" بالکل ناکافی ہے۔ اسی طرح دوسرے الفاظ بھی ہیں۔

اب یہ پڑھتے ہی مجھ سے یہ سوال ہوگا کہ آخر میں ہی ترجمہ کر کے دکھا دوں۔ معاف کیجئے گا، میں عربی سے ایسا ہی نابلد ہوں جیسے کوئی ایسکیمو اُردو سے۔ ہاں کچھ تجاویز پیش کر سکتا ہوں۔

سب سے پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ اُردو میں حمد، رب، عالمین وغیرہ کیا مروج نہیں؟ خدا کی تعریف کے لئے ہم آپ "حمد" ہی تو استعمال کرتے ہیں، تعریف اور ستائش تو انسانوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ترجمہ کا مطلب یہ نہیں کہ زبردستی اصل تحریر کے الفاظ ہٹا ہٹا کر دوسرے الفاظ بھرے جائیں خواہ اصل سے بھی زیادہ غیر معروف کوئی لفظ آ جائے، جیسا کہ آزادؒ کے ترجمے کا حال ہے۔

غرض اُردو میں قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ جن الفاظ کے مناسب ترین متبادل الفاظ ہمارے یہاں نہیں ہیں، انھیں جوں کا توں اُردو ترجمے میں رکھ دیں گے۔ جیسا کہ حمد، رب، عالمین وغیرہ ہیں۔ اس طرح کیا ہوا ترجمہ آپ کو اصل سے بالکل بے نیاز کر دے گا۔ اور جس طرح عربی علماء میں بعض بعض مقامات پر اختلاف برقرار ہیں، وہی بات ترجمہ میں آ جائے گی۔ رسم خط کی رکاوٹ سے اتنا بھی فائدہ آپ نہیں اٹھائیں گے تو کیا اٹھائیں گے۔

قرآن شریف صرف مسلمانوں کی مذہبی کتاب نہیں، یہ عربی زبان کا بہترین شاہکار ہے۔ اُردو میں اس کا ادبی ترجمہ کرنا ہی پڑے گا۔ کام یہی انجمن کے کرنے کا ہے۔ جس طرح رامائن، مہابھارت، گیتا وغیرہ ترجمے ہوئے ہیں اسی طرح قرآن، انجیل، تلمود وغیرہ کا بھی اُردو میں ترجمہ ہونا چاہئے۔

حمد اللہ کی، رب العالمین کی، رحمٰن و رحیم کی، مالک یوم الدین کی۔ کچھ اسی طرح پر ترجمہ ہونا چاہئے، تاکہ اصل کا رنگ و آہنگ بھی برقرار رہے۔ (انقلاب، ودیش)

خاش وخماش پر غالب کی تقریظ

"ہماری زبان" مورخہ ۱۵ اپریل ۹۷ء میں عبدالوہاب صاحب نیّر پادہ دوری کا ایک مراسلہ بعنوان منفرد چند سے شائع ہوا ہے، جس میں حبیب اللہ ذکا تخلص کی کتاب "خاش وخماش" پر غالب کی تقریظ کے متعلق استفسار کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ حبیب اللہ صاحب ذکا، نظمی سالار جنگ مختار الملک وزیر اعظم کے زمانے میں حیدرآباد آ کر بس گئے اور آج بھی ان کی اولاد اور بعض دیگر رشتہ دار یہاں آباد ہیں۔ ذکا کے حالات تذکرہ حیات اعظم یعنی صبح وطن اور گلزار اعظم میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ شعرائے دکن عبدالجبار خاں، اور میری کتاب دکن میں اُردو میں بھی ان کا حال درج ہے۔ نیز جناب مالک رام صاحب نے "تلامذہ غالب" کے نام سے جو کتاب شائع فرمائی ہے اس میں بھی ذکا کے حالات موجود ہیں۔

ذکا کی کتاب خاش وخماش ایک زمانہ میں شائع ہو چکی تھی، اس کے ساتھ غالب کی تقریظ بھی شائع ہوئی ہے، علاوہ ازیں بعض دوسری کتابوں میں بھی غالب کی تقریظ شائع ہوئی ہے۔

جامعہ نظامیہ (شبلی گنج حیدرآباد) میں خاش وخماش کا وہ اصلی قلمی نسخہ موجود ہے جس پر غالب نے اپنے

قلم سے تقریظ لکھی ہے اور نیچے اپنے نام کے بجائے مہر بھی ثبت کردی ہے۔ اگر تسنیم صاحب کو اس کی نقل مطلوب ہے تو معتمد صاحب جامعہ نظامیہ سے طلب فرما سکتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ صراحت تسنیم صاحب کے لئے کافی ہوگی۔

(نصیر الدین ہاشمی)

باہمی تعاون

اب اُردو کی ہمت افزائی کے لئے سوچ سمجھ کر کام کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ صرف ایک چیز جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ادارے اداروں کے ساتھ، اور ادیب ادیبوں کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔ ان ادیبوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ خود فائدہ اُٹھانا جانتے ہیں اور نہ دوسرے ادیبوں کو آگے بڑھتا دیکھ سکتے ہیں۔ اسطرح ایک خاص تعداد ایسے ادیبوں کی ہے جو محض ذاتی بغض و عداوت کے تحت بعض اچھے ادیبوں پر خواہ مخواہ کی تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسے حضرات زیادہ تر کسی فرضی نام سے مضامین شائع کرواتے ہیں۔ صحیح تعمیری تنقید میں تو کوئی حرج نہیں مگر اس جرم کے تحت جو اب تنقید شروع ہوئی ہے، اس کو روکنے کی ساری ذمہ داری اُردو کے اچھے رسالوں کے اڈیٹروں پر عائد ہوتی ہے صحت مند ادب پیدا کرنے کے لئے اور اس بلیک میلنگ کو ختم کرنے کے لئے چند تجویزیں پیش کرتا ہوں:-

(۱) مضمون چھپتے وقت ہر اڈیٹر کے پاس مضمون نگار کا نام، صحیح پتہ، تعلیم، اور اس کا عہدہ ہونا چاہیئے۔

(۲) ہر اڈیٹر کو جب کسی نئے نام سے کوئی تنقیدی مضمون ملے، تو اس کا یہ فرض ہے کہ اسکو فوراً نہ چھاپے، بلکہ مضمون نگار کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرے۔

(۳) ہر اڈیٹر کو متواتر سنجیدہ کام کرنے والے ادیب کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔

(۴) تمام رسائل کے اڈیٹروں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔

(۵) تمام اڈیٹروں کی ایک متحدہ انجمن ضروری ہے جس کی ہر ماہ ایک میٹنگ ہو، اور آپس کے تبادلۂ خیالات سے بہت سے یکساں قواعد بنائیں۔

ان پانچ اصولوں پر اگر عمل کیا جائے تو ہر اڈیٹر قانونی چارہ جوئی سے بھی اپنا دامن صاف رکھ سکتا ہے۔

یہاں امریکہ میں بھی اس قسم کا بلیک میل عام ہے یہاں ہر ادیب اپنا وکیل رکھتا ہے اور حکومت بھی ہزاروں بلین ڈالر FBI[*] پر صرف کرتی ہے۔ یہاں طالب علم کی وقعت

[*] FBI - Federal Bureau of Investigation

بقیہ: دیوان شاہ نیاز (قلمی)

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے اس بلا میں پھنسا دیا

پہلے مصرعہ میں لفظ "کیا" حرف "ک" کی آواز دیتا ہے اسی طرح تذکیر و تانیث میں بھی فرق ہے۔ مثلاً

ہفتاد و دو ملت میں کبھی جنگ نہ ہوتا

جنگ کو مذکر باندھا ہے۔

شاہ نیاز شعراء میں رومی اور عطار کے معتقد ہیں، خیال بندی کو ناپسند کرتے ہیں،

نیاز شعر خیالی نہیں پسند عوام
غزل کہو تو کہو ٹک خیال بندی چھوڑ

اُس دور کے شاعرانہ مزاج اور لسانی حالت کے مطالعہ کے لئے شاہ نیاز کا دیوان قابل قدر ہے کیونکہ شاہ صاحب کے نزدیک "پسند عوام" کی اہمیت ہے، عوام میں زبان اور شاعری کا جو معیار ہے اس کا اندازہ ایسے ہی شاعر کے کلام سے کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق زیادہ سے زیادہ عوام سے رہا ہو۔

نیاز کے بعض اشعار بہت مقبول ہوئے، یہاں تک کہ اکثر غلطی سے ہم انھیں دوسرے شعراء سے منسوب کر دیتے ہیں مثلاً یہ مصرع بہت مشہور ہے۔

گر ایک عشق کی کشت غم جسے کہتے ہیں سو ہری رہی

نیاز کی غزل کا مصرع ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

مری آنکھوں میں اگر ایسی رہی تیری سنت جلوہ گری رہی
تو ہمیشہ کو ہیں اپنے آپ سے یونہی جلوہ گری رہی

دیوان فارسی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

دیوان فارسی شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی

ہر کہ خواند دعا طمع دارم　　زاں کہ من بندۂ گنہگارم

پھر بسم اللہ سے دیوان شروع ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شعر مذکور ہماری نگاہ سے سنہ ۱۱۹۵ھ کے مخطوطہ دیوان صائب میں بھی گذرا ہے۔

نیاز خود کو فصیح البیان کہتے ہیں اور دو غزلہ سہ غزلہ بھی کہتے ہیں، ان کے دیوان کی قدامت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کا مطالعہ نگاہ غور سے کیا جائے، زیر نظر مخطوطہ کو چونکہ مطبوعہ نسخوں کے مقابل بنیادی اہمیت حاصل ہے اس لئے اس کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔

* صرف اس کے کام سے ہے، اُستاد کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس نے سنیچر کی رات کو کتنی بیر (Beer) پی۔
(محمد اسلم خواجہ، میڈیسن (وسکانسن))

خان

"سر سید کے نام کے ساتھ "خان" کب اور کیسے شامل ہوا؟ اس موضوع پر ناظرین کے کچھ مراسلات گزشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد تین خط ہمیں اور موصول ہوئے تھے، جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر اب مزید بحث کی ضرورت نہیں۔" (ادارہ)

(۱) یکم مارچ ۱۹۶۳ء کے ہماری زبان میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ "سر سید احمد صاحب خان کب سے ہو گئے"؟ اس کے جواب میں متعدد مراسلے شائع ہو چکے ہیں، لیکن اس اعتراض کا ایک پہلو اور بھی تھا جس پر اب تک توجہ نہیں کی گئی وہ یہ کہ اس سوال سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ معترض کے نزدیک سید اور خان دو مختلف بلکہ متضاد چیزیں ہیں۔ ایک شخص سید اور خان دونوں نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ایک دو نہیں درجنوں بلکہ اس سے بھی زیادہ افراد کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں جن کے نام کے شروع میں سید اور آخر میں خان لکھا گیا اور لکھا جاتا ہے۔ صرف چند مشہور نام لکھتا ہوں:۔

میر حشمت اللہ خاں (تذکرہ ابن طوفان ص) آغا علی خاں (بحر الفصاحت ۳۱۸، ۴۵۲ وغیرہ، دیوان شعرا الماس درخشاں، طوفان ص۲۳ وغیرہ) یہ مسلم ہے کہ آغا علی خاں ابن معتمد الدولہ سید تھے، سید محمد تقی خاں، میر علی خاں، سید محمد تقی خاں، جعفر حسین خاں (دمعۃ الاخیار ۲، ۲۰۳) میر قدر علی خاں پسر میر افضل علی خاں (تاریخ اودھ ج ۲ ص ۲۶۹ وغیرہ) سید اسد علی خاں (سخن شعرا ص ۲۶) میر ہادی علی خاں عشق (تذکرہ آرزو) سید علی نقی خاں (دیوان ہزبر) سید محمد خاں رند (گلدستۂ عشق) سید احمد حسین خاں سالک (دیوان جاہ ابن سالک) سید بہادر حسین خاں انجم (دیوان یاس اول) سید محمد افضل علی خاں خلف سید مظفر علی خاں اسیر (کلیات سحر) سید علی حسن خاں (کلیات منیر) میر محمد خاں سرور (سخن شعرا ص ۲۲۱) سید محمود خاں (تذکرہ سرور ص) یہ چند نام سرسری طور پر مختلف کتابوں سے نقل کیے گئے۔ ان سب میں سید اور خان لگا ہوا ہے پھر سید احمد خاں کے نام میں، اگر یہ دونوں الفاظ شامل ہیں تو اعتراض کی بات کیا ہے؟

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا مراسلہ اس سلسلے میں ۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء کے ہماری زبان میں شائع ہوا ہے جس میں "جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" خطاب عطا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جواد الدولہ عارف جنگ کے خطاب سے بحث ہی نہ تھی اور خطابات "خان" کے علاوہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس عہد میں خان اور خان بہادر دونوں خطابات تھے چنانچہ نیا دور میں مطبوعہ ایک مراسلہ سے معلوم ہوا تھا کہ والد کو خطاب خان بہادر اور ان کے بیٹے کو خطاب خان عطا ہوا تھا؟ آثار الصنادید مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء کے سرورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے۔ "سر سید احمد خان بہادر عارف جنگ"۔ اس طرح سر سید کے نام کے ساتھ "خان بہادر" کے الحاق کا بھی پتہ چلتا ہے اس طرح بحث بدستور باقی رہتی ہے کہ خطاب خان تھا یا خان بہادر؟ میرا خیال ہے کہ خطاب خان بہادر تھا جو کثرت استعمال سے مخفف ہو کر خان رہ گیا۔ اس تخفیف کے لیے متعدد نظیریں ملتی ہیں۔

جہاں تک لفظ خان کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اعزاز کے لیے ناموں کے ساتھ الحاق کیا جاتا رہا ہے خواہ خطاب کی صورت میں ہو یا یونہی روا ہو گیا۔ غالباً یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ شخص جس کے نام کے ساتھ خان لگا ہو پٹھان ہی ہو۔ ایسا شخص نجیب الطرفین سید بھی ہو سکتا ہے اور ٹھیٹھ ہندی بھی۔ (محمد انصار اللہ نظر۔ کان پور)

(۲) یکم اپریل کے ہماری زبان میں نور الرحمن صاحب کا مکتوب اور اس پر آپ کی رائے نظر سے گزری۔ اس پر مجھے یاد آیا جب ہم پانچویں درجے میں پڑھا کرتے تھے تو نصاب میں ایک کتاب "حدیقۂ ادب" داخل تھی۔ اس میں سر سید کے تذکرے میں جو الفاظ درج تھے مجھے آج تک یاد ہیں۔

"سید احمد نام۔ سر اور خاں خطاب تھے۔ سر کا خطاب سرکار انگریزی سے ملا تھا اور خاں کا خطاب بادشاہ دہلی نے عطا کیا تھا۔"

محترمہ صاحبہ سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے خان پر بہادر کا اضافہ کر دیا۔ میرے خیال میں صدر امین یا صدر الصدور کے ساتھ اس خطاب کو لازم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس عہدے یا کسی دوسرے عہدے پر کام کرنے والے کو یہ اعزازی خطاب بطور خاص دیا جا سکتا ہو گا۔ جس طرح "سرکار انگریزی" آپ کو خاں صاحب بہادر وغیرہ کے نام سے یاد کرتی تھی۔ اس میں بھی خاں صاحب بطور خطاب استعمال ہوتا تھا۔ خان بہادر کا خطاب سر سید کو کبھی نہیں ملا۔ لیکن خان کا خطاب انہیں قلعۂ دہلی سے ضرور عطا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق کی بہرحال ضرورت ہے۔ (فضل الرحمن افضل)

(۳) یکم اپریل ۱۹۶۳ء کے ہماری زبان میں جناب نور الرحمن صاحب (رجسٹرار جامعہ اردو) کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ انہوں نے اپنے مراسلے میں لکھا ہے "اُس زمانے میں صدر امین یا صدر الصدور کے نام کے ساتھ "خان" لکھا جاتا تھا۔ مثلاً مولوی محمد قیوم خان، مولوی کریم اللہ خاں۔ یہ دونوں صاحب بھی سید صاحب کے ہم عصر تھے، عہدہ بھی وہی تھا۔ لیکن نہ پٹھان تھے اور نہ خان بہادر کا خطاب رکھتے تھے اور نہ ان کے خاندان یا رشتہ داروں میں کسی دوسرے شخص کے نام کے ساتھ لفظ "خان" استعمال ہوتا تھا۔ لیکن سر سید کے خاندان یا رشتہ داروں کے نام سے متعلق ایسا نہیں کہا جا سکتا۔

(اس کا سلسلہ صفحہ ۱۲ پر دوسرے کالم میں دیکھیے)

عبدالحئی

تبصرہ

"پریت کے گیت"

مرتبہ : فضل اللہ حافظ
ناشر : ڈی۔ کے۔ ڈھلگے۔ ہارڈیکر باغ
حمایت نگر۔ حیدرآباد۔

۱۴ر مارچ ۱۹۶۴ء کو آنجہانی مہاراجہ سرکشن راؤ بہادر شاد کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر حیدرآباد میں ایک مقصدی مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد قومی یک جہتی کا پرچار کرنا تھا۔ آنجہانی کشن پرشاد قومی یک جہتی کے نظریہ کے علم بردار اور جوشیلے ترجمان تھے۔ چنانچہ اس مشاعرہ کے لئے خود انھیں کے مندرجہ ذیل شعر کو طرح قرار دیا گیا تھا۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں　　ہر مذہب ہے میرا ایماں

اس "طرح" پر حیدرآباد کے ممتاز شعراء نے غزلیں کہیں۔

ان تمام تخلیقات کو "پریت کے گیت" میں جمع کر دیا گیا ہے۔

آج ملک کی سب سے بڑی ضرورت قومی یک جہتی ہے۔ قومی یک جہتی کے بل بوتے پر ہی ہم دشمنوں سے اپنی سرحدوں کا بچاؤ کر سکتے ہیں۔ خود ملک کی اندرونی فضا کو پُرامن رکھنے کے لئے اور ملک کو اقتصادی ترقی کی مخصوص بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لئے قومی یک جہتی کی اشد ضرورت ہے۔ مشاعرہ کے منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں خاص طور پر مسٹر ڈی۔ کے۔ ڈھلگے کہ انہوں نے اس مشاعرہ کی تحریک اور انتظام کر کے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

زیرِ نظر "گلدستہ" میں جو تخلیقات شامل ہیں وہ خلوص میں رچی ہوئی ہیں اور عوام کے دل پر ان کا بہت اچھا اور گہرا اثر پڑنا لازمی ہے۔ اس گلدستہ کا نام بھی بڑا پیارا اور موزوں ہے۔

ہمارے لئے یہ بات اور زیادہ خوشی کی ہے کہ قومی یک جہتی کے ترجمان کی حیثیت سے اُردو ہی سب سے پہلے میدان میں آئی ہے، اور کیوں نہ ہو اردو ہے بھی قومی یک جہتی کی ہی پیداوار۔ یہ ہندوستان میں پلی بڑھی اور اس کی نشو و نما میں ملک کے تمام فرقوں کا برابر کا ہاتھ ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ قومی یک جہتی کے پھیلانے میں اور ملک کے عوام کو مختلف ابتلائی دوروں میں اُردو نے جو دعوتِ عمل و اتحاد دی ہے اُس کی مثال کسی اور زبان کا ادب نہیں پیش کر سکتا۔ چینی حملہ کے وقت اُردو نے عوام میں جو مجاہدانہ جوش و خروش اور جذبۂ سرفروشی پیدا کیا تھا وہ حال ہی کی بات ہے اور اب ملک میں آپس کی پھوٹ کو دور کرنے کے لئے بھی اُردو سر سے کفن باندھ کر میدان میں آگئی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں بھی کامیاب ہو گی۔

کیا ہی اچھا ہو اگر ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی قومی یک جہتی کو پھیلانے کے مقصدی مشاعرے منعقد کئے جائیں۔ اور ان مشاعروں میں حصّہ لینے والے شعراء کی تخلیقات کو بھی شائع کر دیا جائے۔

بقیہ بسلسلۂ صفحہ ۱۱

علی گڑھ میگزین کے "علی گڑھ نمبر" میں صفحہ ۱۱۵ پر خلیق احمد نظامی صاحب اپنے مضمون "سید احمد خاں اور سید جمال الدین افغانی" کے حاشیے میں لکھتے ہیں :۔

"سیرت فریدیہ میں سید احمد خاں نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین خاں کا حال لکھا ہے۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے۔ (سیرت فریدیہ مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی)" سر سید کے نانا کے نام کے آگے "خان" لکھا دیکھ کر اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ سر سید کو "خان بہادر" کا خطاب نہیں ملا تھا۔ بلکہ پٹھان ہونے کا شک[1] گذرتا ہے ۔۔۔؟

(مناظر عاشق ہرگانوی)

[1] یہ شک بے جا ہے۔ ادارہ

مالک انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذر حسین، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔